مجدِّدِ الفِ ثانیؒ

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ساتویں صدی میں فتنۂ تاتار نے ہندوکُش سے اُس پار کی دُنیا کو تو بالکل تاخت وتاراج کر دیا، مگر ہندوستان اس کی دست بُرد سے بچ گیا تھا۔ اس ڈھیل نے یہاں کے مترفین کو اُس غلط فہمی میں ڈال دیا جو ہمیشہ فریفتگانِ زینتِ دنیا کو لاحق ہوتی ہے، یہاں وہ تمام خرابیاں پرورش پاتی رہیں جو خُراسان و عراق میں تھیں۔ وہی پادشاہوں کی خداوندی، وہی اُمراء واہل دولت کی عیش پسندی، وہی باطل طریقوں سے مال لینا اور باطل راستوں میں خرچ کرنا، وہی جبر وظلم کی حکومت، وہی خُدا سے غفلت اور دین کی صراطِ مستقیم سے بُعد، رفتہ رفتہ نوبت اکبر بادشاہ کے دَورِ حکومت تک پہنچی جس میں گمراہیاں اپنی حد کو پہنچ گئیں۔

اکبر کے دربار میں یہ رائے عام تھی کہ ملّتِ اسلام جاہل بدوؤں میں پیدا ہوئی تھی کسی مہذّب وشائستہ قوم کے لیے وہ موزوں نہیں۔ نبوّت، وحی، حشر ونشر، دوزخ وجنّت ہر چیز کا مذاق اُڑایا جانے لگا۔

قرآن کا کلامِ الٰہی ہونا مشتبہ، وحی کا نزول عقلاً مستبعد، مرنے کے بعد ثواب و عذاب غیر یقینی، البتہ تناسخ ہر آئینہ ممکن واقرب الی الصواب، معراج کو علانیہ محال قرار دیا جاتا۔ ذاتِ نبوی پر اعتراضات کیے جاتے خصوصاً آپؐ کی ازواج کے تعدّد اور آپؐ کے غزوات وسرایا پر کُھلّم کُھلّا حرف گیریاں کی جاتیں۔ یہاں تک کہ لفظ احمد اور محمد سے بھی بیزاری ہوگئی اور جن کے ناموں میں یہ لفظ شامل تھا ان کے نام بدلے جانے لگے، دُنیاپرست علماء نے اپنی کتابوں کے خطبوں میں نعت لکھنی چھوڑ دی، بعض ظالم اس حد تک بڑھے کہ دجّال کی نشانیاں ہادیٔ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم پر چسپاں کرنے لگے۔ العیاذ باللہ، العیاذ باللہ! — دیوان خانۂ شاہی میں کسی کی مجال نہ تھی کہ نماز ادا کر سکے۔ ابوالفضل نے روزہ، نماز، حج اور دوسرے شعائرِ دین پر سخت اعتراضات کیے اور اُن کا مذاق اُڑایا، شعراء نے ان شعائر کی ہجو لکھی جو عوام کی زبانوں تک پہنچی۔

بہائی نظریے کی بنا بھی دراصل اکبری عہد ہی میں پڑی تھی اس وقت یہ نظریہ قائم کیا گیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت پر ایک ہزار سال گزر چکے ہیں اور اس دین کی مدّت ایک ہزار سال ہی تھی اس لیے اب وہ منسوخ ہوگیا اور اس کی جگہ نئے دین کی ضرورت ہے۔ اس نظریے کو سکّوں کے ذریعہ پھیلایا گیا کیونکہ اس زمانے میں نشرواشاعت کا سب سے زیادہ قوی ذریعہ یہی تھا۔ اس کے بعد ایک نئے دین اور

نئی شریعت کی طرح ڈالی گئی، جس کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے مذہب کو ملا کر ایک مخلوط مذہب بنایا جائے تاکہ شاہی حکومت مستحکم ہو۔ دربار کے خوشامدی ہندوؤں نے اپنے بزرگوں کی طرف سے پیشین گوئیاں سنانی شروع کر دیں کہ فلاں زمانے میں ایک گئو رکھشک مہاتما بادشاہ پیدا ہوگا۔ اور اسی طرح بندۂ زر علماء نے بھی اکبر کو مہدی اور صاحبِ زماں اور امامِ مجتہد وغیرہ ثابت کرنے کی کوشش کی۔ ایک "تاج العارفین" صاحب یہاں تک بڑھے کہ اکبر کو انسانِ کامل اور خلیفۃ الزماں ہونے کی حیثیت سے خُدا کا عکس ہی ٹھیرا دیا۔ عوام کو سمجھانے کے لیے کہا گیا کہ "حق اور صدق" (عالم گیر سچّائیاں) تمام مذاہب میں موجود ہیں۔ کوئی ایک ہی دین حق کا اجارہ دار نہیں ہے۔ لہٰذا سب مذہبوں میں جو باتیں حق ہیں انھیں لے کر ایک جامع طریقہ بنانا چاہیے، اور اس کی طرف لوگوں کو دعوتِ عام دینی چاہیے تاکہ ملّتوں کے سب اختلافات مٹ جائیں۔ اسی طریقِ جامع کا نام دینِ الٰہی ہے۔ اس نئے دین کا کلمہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ اَکْبَرُ خَلِیْفَۃُ اللّٰہِ تجویز کیا گیا۔ جو لوگ اس دین میں داخل ہوتے ان کو "دین اسلام مجازی وتقلیدی کہ از پدراں دیدہ شنیدہ ام" سے توبہ کرکے "دین الٰہی اکبر شاہی" میں داخل ہونا پڑتا، اور داخل ہونے کے بعد ان کو لفظ "چیلہ" سے تعبیر کیا جاتا تھا۔ سلام کا طریقہ بدل کر یوں کر دیا گیا کہ سلام کرنے والا "اللہ اکبر" اور جواب دینے والا "جل جلالہ" کہتا،

یاد رہے کہ بادشاہ کا نام جلال الدین اور لقب اکبر تھا۔ چیلوں کو بادشاہ کی تصویر دی جاتی اور وہ اسے پگڑی میں لگاتے، بادشاہ پرستی اس دین کے ارکان میں سے ایک رکن تھی۔ ہر روز صبح کو بادشاہ کا درشن کیا جاتا۔ اور بادشاہ کے سامنے جب حاضری کا شرف عطا ہوتا تو اس کے سامنے سجدہ بجالایا جاتا۔ علمائے کرام اور صوفیائے باصفا دونوں اپنے اس قبلۂ حاجات اور کعبۂ مرادات کو بے تکلف سجدہ فرماتے تھے اور اس صریح شرک کو "سجدۂ تحیۃ" اور "زمین بوسی" جیسے الفاظ کے پردے میں چھپاتے تھے۔ یہ وہی ملعون حیلہ بازی تھی جس کی پیشین گوئی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی تھی کہ ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ جب لوگ حرام چیز کا نام بدل کر اس کو حلال کرلیا کریں گے۔

اس نئے دین کی بنا تو یہ کہہ کر رکھی گئی تھی کہ اس میں بلا کسی تعصب کے ہر مذہب کی باتیں لی جائیں گی۔ مگر دراصل اس میں اسلام کے سوا ہر مذہب کی پزیرائی تھی اور نفرت وعداوت کے لیے صرف اسلام اور اس کے احکام و قوانین ہی کو مختص کرلیا گیا تھا۔ پارسیوں سے آتش پرستی لی گئی، اکبری محل میں دائمی آگ کا الاؤ روشن کیا گیا اور چراغ روشن کرنے کے وقت قیام تعظیمی کیا جانے لگا، عیسائیوں سے ناقوس نوازی اور تماشائے صورت ثالث ثلثہ اور اسی قسم کی چند چیزیں لی گئیں سب سے زیادہ نظر عنایت ہندویت پر تھی کیونکہ یہ ملک کی اکثر آبادی کا مذہب

تھا اور پادشاہی کی جڑیں مضبوط کرنے کے لیے اس کی استمالت ضروری تھی۔ چنانچہ گائے کا گوشت حرام کیا گیا۔ ہندو تہوار، دیوالی، دسہرہ، راکھی، پونم، شیوراتری وغیرہ پوری ہندوانہ رسوم کے ساتھ منائے جانے لگے۔ شاہی محل میں ہَوَن کی رسم ادا کی جانے لگی۔ دن میں چار وقت آفتاب کی عبادت کی جاتی اور آفتاب کے ایک ہزار ناموں کا جاپ کیا جاتا۔ آفتاب کا نام جب زبان پر آتا تو "جلّت قدرتہٗ" کے الفاظ کہے جاتے۔ پیشانی پر قشقہ لگایا جاتا، دوش و کمر پر جنیو ڈالا جاتا اور گائے کی تعظیم کی جاتی۔ معاد کے متعلق عقیدۂ تناسخ تسلیم کر لیا گیا اور برہمنوں سے ان کے دوسرے بہت سے اعتقادات سیکھے گئے، یہ سارا معاملہ تو تھا دوسرے مذاہب کے ساتھ۔ رہا اسلام تو اس کے معاملے میں بادشاہ اور درباریوں کی ایک ایک حرکت سے ظاہر ہوتا تھا کہ ان کو اس سے ضد اور چڑ ہو گئی ہے۔ اسلامی تعلیمات کے خلاف دُوسرے مذاہب والوں کی طرف سے جو بات دربار کا رنگ دیکھ کر فلسفیانہ و صوفیانہ انداز میں پیش کر دی جاتی اُسے وحیِ آسمانی سمجھ لیا جاتا اور اس کے مقابلہ میں اسلامی تعلیم رد کر دی جاتی۔ علمارِ اسلام اگر اسلام کی طرف سے کوئی بات کہتے، یا کسی گمراہی کی مخالفت کرتے تو انہیں "فتیہ" کے نام سے موسوم کیا جاتا۔ جس کے معنی ان کی اصطلاحِ خاص میں احمق اور ناقابلِ التفات آدمی کے ہو گئے تھے، چالیس آدمیوں کی کمیٹی مذاہب کی تحقیق کے لیے مقرر کی گئی تھی جس میں

تمام مذاہب کا مطالعہ بڑی رواداری بلکہ عقیدت مندی کے ساتھ کیا جاتا تھا مگر اسلام کا نام آتے ہی اس کا مذاق اُڑایا جانے لگتا تھا۔ اور اگر اسلام کا کوئی حامی جواب دینا چاہتا تو اس کی زبان بند کردی جاتی تھی۔ یہ برتاؤ اسی حد تک نہ رہا بلکہ عملاً اسلام کے احکام کی دل کھول کر ترمیم و تنسیخ کی گئی۔ سود، جوئے اور شراب کو حلال کیا گیا۔ شاہی مجلس میں نوروز کے موقع پر شراب کا استعمال ضروری تھا۔ حتٰی کہ قاضی و مفتی تک پی جاتے تھے۔ ڈاڑھی مُنڈوانے کا فیشن عام کیا گیا اور اس کے جواز پر دلائل قائم کیے گئے۔ چچازاد اور ماموں زاد بہن سے نکاح کو ممنوع ٹھیرایا گیا۔ لڑکے کے لیے سولہ سال اور لڑکی کے لیے ۱۴ سال کی عمر نکاح مقرر کی گئی۔ ایک بیوی سے زیادہ بیویاں رکھنے کی ممانعت کی گئی، ریشم اور سونے کے استعمال کو حلال کیا گیا۔ شیر اور بھیڑیے کو حلال کیا گیا۔ سُور کو اسلام کی ضد میں نہ صرف پاک بلکہ ایک مقدس جانور قرار دیا گیا حتٰی کہ صبح آنکھ کھولتے ہی اسے دیکھنا مُبارک خیال کیا جاتا تھا۔ مُردوں کو دفن کرنے کے بجائے جلانا یا پانی میں بہانا احسن ٹھیرایا گیا اور اگر کوئی دفن ہی کرنا چاہے تو سفارش کی گئی کہ پاؤں قبلہ کی طرف رکھے جائیں۔ اکبر خود اسلام کی ضد میں قبلہ ہی کی طرف پاؤں کرکے سونے کا التزام کرتا تھا۔ حکومت کی تعلیمی پالیسی بھی سراسر اسلام کی مخالف تھی۔ عربی زبان کی تعلیم اور فقہ و حدیث کے درس کو ناپسندیدہ سمجھا جاتا تھا اور جو لوگ ان

علوم کو حاصل کرتے وہ حقیر خیال کیے جاتے ۔ علوم دینی کے بجائے حکمت و فلسفہ، ریاضی وتاریخ اور اس نوع کے علوم کو سرکاری سرپرستی حاصل تھی۔ زبان میں ہندیت پیدا کرنے کی طرف خاص میلان تھا اور عربی حروف کو زبان سے خارج کرنے کی بھی تجویزیں تھیں ۔ ان حالات کی وجہ سے دینی مدرسے ویران ہونے لگے اور اکثر اہل علم ملک چھوڑ چھوڑ کر نکلنے لگے ۔

یہ تو تھا حکومت کا حال اور عوام کا حال یہ تھا کہ جو لوگ باہر سے آتے تھے وہ ایران وخراسان کی اخلاقی و اعتقادی بیماریاں ساتھ لائے تھے ۔ اور جو لوگ ہندوستان ہی میں مسلمان ہوئے تھے ان کی اسلامی تعلیم و تربیت کا کوئی خاص انتظام نہ تھا اس لیے وہ پرانی جاہلیت کی بہت سی باتیں اپنے خیالات اور اپنی عملی زندگی میں لیے ہوئے تھے ۔ ان دونوں قسم کے مسلمانوں نے مل جل کر ایک عجیب مرکب تیار کیا تھا، جس کا نام "اسلامی تمدن" تھا، اس میں شرک بھی تھا، نسلی اور طبقاتی امتیازات بھی تھے۔ اوہام وخرافات بھی تھے اور نوایجاد رسموں کی ایک نئی شریعت بھی تھی ۔ دنیا پرست علماء و مشائخ نے نہ صرف اس مخلوط سے موافقت کر لی تھی بلکہ وہ اس نئے مت کے پروہت بن گئے تھے ۔ لوگوں کی طرف سے ان کو نذرانے پہنچتے اور ان کی طرف سے لوگوں کو فرقہ بندی کا تحفہ ملتا ۔

پیران طریقت کے ہاتھوں سے ایک اور بیماری پھیل رہی تھی اشراقیت رواقیت (STOICISM) مانویت اور ویدانتزم کی آمیزش سے ایک عجیب قسم

کا فلسفیانہ تصوّف پیدا ہوگیا تھا جسے اسلام کے نظامِ اعتقادی و اخلاقی میں ٹھونس دیا گیا تھا۔ طریقت و حقیقت شرعِ اسلامی سے الگ اور اس سے بے نیاز قرار دی گئی تھیں۔ باطن کا کوچہ ظاہر سے جُدا بنا لیا گیا تھا۔ اور اس کوچے کا قانون یہ تھا کہ حدودِ حلال و حرام رخصت، احکامِ دین عملاً منسُوخ، اور ہوائے نفس کے ہاتھ میں کلّی اختیارات۔ جس فرض کو چاہے ساقط کرے اور جس چیز کو چاہے فرض، بلکہ فرض الفرض بنا دے۔ جس حلال کو چاہے حرام کر دے اور جس حرام کو چاہے حلال کر دے۔ ان عام پیروں سے بہتر جن کی حالت تھی ان پر بھی کم و بیش فلسفیانہ تصوّف کے اثرات پڑے ہوئے تھے اور وحدۃ الوجود کے ایک غلط تصوّر نے خصوصیت کے ساتھ تمام قوائے عمل کو بیکار کر دیا تھا۔

یہ حالات تھے جب اکبری سلطنت کے ابتدائی ایّام میں شیخ احمدؒ سرہندی[1] پیدا ہوئے ان کی تعلیم و تربیت ایسے لوگوں میں ہوئی تھی جو اس دَور کے صالح ترین لوگ تھے۔ گو اپنے گردوپیش کے فساد کا مقابلہ نہ کر سکتے تھے مگر کم از کم اپنے ایمان اور عمل کو بچائے ہوئے تھے اور جہاں تک ہوسکتا تھا دُوسروں کی اصلاح بھی کر رہے تھے۔ خصوصیت کے ساتھ شیخ کو سب سے زیادہ فیض حضرت باقی باللہ صاحب سے پہنچا تھا۔ جو

---

[1] پیدائش ۹۷۱ھ / ۱۵۶۳ء وفات ۱۰۳۴ھ / ۱۶۲۴ء

اپنے وقت کے ایک بڑے صالح بزرگ تھے مگر خود شیخ کی ذاتی صلاحیتوں کا حال یہ تھا کہ جب حضرت موصوف کے ساتھ راہ و رسم کی ابتدا ہوئی تھی اسی وقت انہوں نے شیخ کے متعلق اپنے یہ خیالات ایک دوست کو لکھ کر بھیجے تھے کہ :

"حال میں سرہند سے ایک شخص شیخ احمد نامی آیا ہے نہایت ذی علم ہے بڑی عملی طاقت رکھتا ہے۔ چند روز فقیر کے ساتھ اس کی نشست و برخاست ہوئی ہے۔ اس دوران اس کے حالات کا جو مشاہدہ ہوا اس کی بنا پر توقع ہے کہ آگے چل کر یہ ایک چراغ ہوگا جو دنیا کو روشن کر دے گا۔"

یہ پیشین گوئی پوری ہوئی۔ ہندوستان کے گوشوں میں بہت سے حق پرست علماء اور سچے صوفیہ بھی اس وقت موجود تھے، مگر ان سب کے درمیان وہ ایک اکیلا شخص تھا جو وقت کے ان فتنوں کی اصلاح اور شریعت محمدیؐ کی حمایت کے لیے اُٹھا اور جس نے شاہی قوت کے مقابلہ میں یکہ و تنہا احیاء دین کی جدّ و جہد کی۔ اس بے سروسامان فقیر نے علی الاعلان اُٹھ کر ان گمراہیوں کی مخالفت کی جنہیں حکومت کی حمایت حاصل تھی اور اس شریعت کی تائید کی جو حکومت کی نگاہ میں مبغوض تھی۔ حکومت نے اس کو ہر طرح دبانے کی کوشش کی حتیٰ کہ جیل بھی بھیجا مگر بالآخر وہ فتنے کا منہ پھیرنے میں کامیاب ہوگیا۔ جہانگیر جس نے

سجدۂ تحیتہ نہ کرنے پر شیخ کو گوالیار کے قیدخانہ میں بھیج دیا تھا، آخرکار شیخ کا معتقد ہوگیا اور اپنے بیٹے خرّم کو، جو بعد میں شاہجہاں کے لقب سے تخت نشین ہوا، ان کے حلقۂ بیعت میں داخل کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام کے متعلق حکومت کی معاندانہ روش احترام سے بدل گئی۔ "دین الٰہی اکبرشاہی"، ان تمام بدعتوں کے ساتھ ختم ہوا جو درباری شریعت سازوں نے گھڑی تھیں۔ اسلامی احکام کی جو ترمیم و تنسیخ کی گئی تھی وہ خود منسوخ ہوگئی۔ حکومت اگرچہ شاہی حکومت ہی رہی مگر کم از کم اتنا ہوا کہ علوم دینی اور احکام شرعی کی طرف اس کا رویّہ کافرانہ ہونے کے بجائے عقیدت مندانہ ہوگیا۔ شیخ کی وفات کے تین چار سال بعد عالم گیر پیدا ہوا اور وہ شیخ ہی کے پھیلائے ہوئے اصلاحی اثرات تھے جن کی بدولت تیموری خاندان کے اس شاہزادے کو وہ علمی اور اخلاقی تربیت مل سکی کہ اکبر جیسے ہادمِ شریعت کا پڑپوتا خادمِ شریعت ہوا۔

شیخ کا کارنامہ اتنا ہی نہیں ہے کہ انھوں نے ہندوستان میں حکومت کو بالکل ہی کُفر کی گود میں چلے جانے سے روکا۔ اور اس فتنۂ عظیم کے کے سیلاب کا مُنہ پھیرا جو اب سے تین چار سو برس پہلے ہی یہاں اسلام کا نام و نشان مٹا دیتا۔ اس کے علاوہ انھوں نے دو عظیم الشان کام اور بھی انجام دیے، ایک یہ کہ تصوف کے چشمۂ صافی کو ان آلائشوں سے جو فلسفیانہ اور راہبانہ گمراہیوں سے اس میں سرایت کرگئی تھیں، پاک کرکے اسلام کا

اصلی اور صحیح تصوّف پیش کیا۔ دُوسرے یہ کہ ان تمام رسومِ جاہلیت کی شدید
مخالفت کی جو اس وقت عوام میں پھیلی ہوئی تھیں اور سلسلۂ بیعت وارشاد
کے ذریعے سے اتباعِ شریعت کی ایک ایسی تحریک پھیلائی جس کے ہزارہا
تربیت یافتہ کارکنوں نے نہ صرف ہندوستان کے مختلف گوشوں میں بلکہ
وسطِ ایشیا تک پہنچ کر عوام کے اخلاق و عقائد کی اصلاح کی۔ یہی کام ہے
جس کی وجہ سے شیخ احمد سرہندی کا شمار مجدّدینِ ملّت میں ہوتا ہے۔